پڑاؤ

پروفیسر اشرف جہاں

سابق صدر شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی، نفیس کالونی، باری پتھ، پٹنہ (بہار)، موبائل:9934991179

میں بار بار صولت حسین کے خط کو پڑھ رہا تھا..... صبح و شام بار بار گرچہ اس خط میں صرف پانچ جملے تھے، لیکن کسی شاعر کے کلام کی طرح ان پانچ جملوں نے مجھے محصور کر رکھا تھا۔ میں ان جملوں کے طلسم سے آزاد ہونے کی کوشش کرتا، لیکن وہ جملے میرے دماغ پر حاوی ہو چکے تھے وہ میرے دماغ میں گونجتے رہتے یہ جملے نہ تھے بلکہ الیکٹرک شاک (Electric Shock) تھے میرے پورے وجود کو جھنجھوڑ ڈالتے۔ اپنی تسکین کے لیے میں خط کو میز سے اُٹھا کر دوبارہ سہ بارہ پڑھنے لگتا۔ پہلا جملہ تو بس یہی تھا۔ ''یار میں خیریت سے ہوں۔'' لیکن دوسرا جملہ؟ لکھا تھا ''میں تم سے سچ کہوں یار تم اسے نصیحت ہی سمجھ لو بیٹے کے گھر جب بہو بھی نوکر پیشہ ہو تو رہنے مت جانا۔'' میں خط کے اس دوسرے جملے میں اُلجھ کر رہ جاتا۔ اس کی وجہ شاید میرے اپنے حالات تھے۔ عمیر میرا اکلوتا بیٹا میرے ریٹائر ہونے کے دو ماہ پہلے سے بضد تھا کہ آپ دونوں میرے ساتھ رہنے آ جایئے۔ اب اکیلے رہنے کا مقصد ہی کیا ہے؟ آپ لوگ بنگلور آ جائیں، لیکن صولت حسین نے تو مجھے ایک نئی فکر میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں نے تو سوچا تھا اور میری بیوی یاسمین کی بھی خواہش تھی کہ دیہات کے اپنے بوسیدہ آبائی مکان کو اور پٹنہ میں خریدے گئے اس فلیٹ کو فروخت کر دوں گا اور عمیر کے لیے بنگلور آئی ٹی سٹی میں ایک بڑا فلیٹ خریدوں گا۔ میری ان چیزوں کا اکلوتا وارث عمیر ہی تو ہے۔ عمر کے اس آخری پڑاؤ میں وہی تو واحد سہارا ہے تو پھر دیر کیوں؟ عمیر کی ماں بھی بیمار رہتی ہے اس کی بھی دیکھ بھال ہوگی۔ عمیر کے بچوں کی توتلی زبانیں یاد آتیں اور خواہش ہوتی فرصت کے اوقات ان کے ساتھ گزاروں، لیکن اس خط نے تو چونکا دیا عمیر کی بیوی بھی نوکری کرتی ہے آج کل بڑے شہروں کی یہ ضرورت بھی ہے اور فیشن بھی کہ میاں بیوی دونوں نوکری پیشہ ہوں۔ تاکہ آپس میں تکرار کم ہو۔ عمیر کہتا ہے اس سے انڈر اسٹینڈنگ (Understanding) رہتی ہے۔

بچوں کے ساتھ رہنا بھی چاہتا تھا، لیکن اب اس خط نے تو مجھے نظر ثانی کے لیے مجبور کر دیا تھا۔ تیسرا جملہ بھی توجہ کا طالب تھا ''فلیٹ کی زندگی بڑے شہروں میں اس کبوتر خانے کی ہے جسے جیل ہی سمجھو یہ خوبصورت پنجرہ ہے جس میں زندگی گھٹتی ہے۔ سانسیں رُکتی ہیں۔''

اس جملے نے تو چلو چلتے ہیں کے میرے خیال کو گہنا دیا تھا اور چاند کی وہ روشن دودھیا زمین راہو اور کیتو کے دام میں گرفتار ہو چکی تھی۔ یہ سب اس خط کا کمال تھا جو لفافے میں بند پیلے رنگ کا بس ایک کاغذ تھا جو میرے ہاتھ سے میرے ٹیبل اور پھر میرے تکیہ کے نیچے پڑا مجھے ضرب لگا رہا تھا۔ تو کیا صولت حسین نے خون دل میں اپنی انگلیاں ڈبو کر خط لکھا ہے کہ اس خط کے جملے زندگی کی ڈھیر ساری مشغولیت کے باوجود میرا پیچھا نہیں چھوڑتے۔

ابھی صرف ایک سال چھ مہینے پہلے کی بات ہے جب کئی برس بعد کڑاکے کی ٹھنڈ پڑی تھی۔ سارے لوگ اپنے اپنے گھروں میں دبک گئے تھے۔ میرے گھر کی کھڑکیاں بھی سرد ہواؤں سے بچنے کے لیے بند تھیں۔ ایک دن سردی کا احساس کم ہوا اور سورج کی روشنی نے یخ بستہ ماحول کو کچھ گرمی بخشی تو میں نے بھی کھڑکی کھولی۔ سامنے ہی صولت حسین کا کوارٹر تھا۔ کوارٹر کے سامنے تھوڑی سی زمین میں گلاب اور ڈالیا کے پھول مسکرا رہے تھے۔ انھوں نے مجھے آنے کی دعوت دی۔ اتفاقاً صولت حسین برآمدے میں ہی ملے۔ تپاک سے گلے ملتے ہوئے میں نے کہا دیکھو تمہارے سامنے کی زمین بھابھی کی محنت سے رنگوں سے سج رہی اور خوشبوں سے مہک رہی ہے۔ میرے مکان کے سامنے بھی تھوڑی سی زمین ہے۔ ابھی میں اتنا ہی کہہ سکا تھا کہ صولت حسین کے چہرے پر اُداسی کی لہر دیکھ کر میں نے اس سے پوچھا کیا ہوا؟ اُداس ہو؟

ہوں، اس نے گہری سانس لی، بیٹھو تو بتاتا ہوں۔ میں ریٹائر ہو گیا ہوں تم بھی جانتے ہو۔ چاہا تھا کہ تم لوگوں کے ساتھ چار چھ مہینے اور رہوں....

تو؟ میں نے پوچھا:

تم تو جانتے ہو میرا بیٹا راشد کتنا ضدی ہے وہ ایک ہفتے میں آ کر مجھے یہاں سے لے جانے کی ضد کر رہا ہے۔

اور بھابھی؟ میں نے جلدی سے پوچھا کیوں کہ صولت حسین بھابھی کے حکم کے بغیر ہلتے بھی نہیں تھے۔

ارے مت پوچھو وہ تو اولاد کے یہاں جانے کی خوشی میں سامان سمیٹنے میں مصروف ہیں۔ان کی تھکن نہ جانے کیسے چھومنتر ہوگئی ہے۔شاید ایکسائٹمنٹ (Excitement) ہے۔

پوتے اور پوتی کے ساتھ رہنے کے تصور سے ہی نہال ہے وہ۔ ارے یار ٹھیک تو ہے۔ میں نے دلاسہ دیا، لیکن میرے دل میں بھی کچھ ہو رہا تھا جیسے کچھ بچھڑنے کا دُکھ۔ پچھلے پانچ برس سے ہم ساتھ رہ رہے تھے ایک دوسرے کی عادت سی ہوگئی تھی، لیکن میں نے اپنے جذبات کو دباتے ہوئے صولت حسین کو سہارا دیا ارے یار تمہارے صرف ڈیڑھ سال بعد تو میں بھی ریٹائر ہو رہا ہوں۔ تمہارا تو شہر میں اپنا فلیٹ بھی ہے صولت حسین نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا ہے تو، لیکن دیکھو تقدیر کہاں لے جاتی ہے، لیکن ایک بات ہے کہ اولاد کے ساتھ رہنے کا سکھ بڑا اطمینان بخش ہوتا ہے۔ضرور جاؤ سفر مبارک ہو۔ گرچہ یہ سب کہتے ہوئے ایک اچھے دوست کی جدائی سے میں بھی افسردہ ہو رہا تھا۔

صولت حسین کے دو بیٹے ہیں دونوں انجینئر چھوٹا بیٹا تابش امریکہ میں مقیم ہے، بیٹی کی شادی ہو چکی ہے۔ داماد سعودی میں نوکری کرتا ہے تو جو کچھ تھا وہ بڑا لڑکا راشد ہی تھا۔اس لیے.....

آخر وہ دن بھی آ گیا۔ میں نے پُرنم آنکھوں سے صولت حسین کو رخصت کیا۔اس دن دل بہت اُداس تھا۔صولت حسین نے بھی حق دوستی برقرار رکھا۔ خط برابر لکھا کرتا۔ موبائل یا فون کم استعمال کرتا کبھی میں نے خیریت پوچھ لی تو جواب روکھا سوکھا، لیکن خط طویل ہوتا ہر قسم کی باتیں کیونکہ اس کا عقیدہ تھا خط سے آدھی ملاقات ہو جاتی ہے اور فون یا اس کی آواز تو تڑپا کر رکھ دیتی ہے۔ میں بات نہیں کرتا۔ وہ مغموم لہجے میں جواب دیتا۔

میں بھی اسے خط لکھتا، فون پر گفتگو نہیں کے برابر تھی۔اس کے خطوط لمبے اور شگفتہ ہوتے تھے۔ میں بیگم کو بھی سناتا کیونکہ ان کے لب مسکرا اُٹھتے وہ جملے ہی ایسا لکھتا تھا، لیکن یہ خط تو میں بیگم کو سنا بھی نہیں سکتا تھا۔اس نے تو میرے وجود کو ہلا کر رکھ دیا تھا گرچہ اس میں پانچ ہی جملے تھے بقیہ خطوط کا تو ایک جملہ بھی یاد نہیں، لیکن اس خط کے چوتھے جملے نے تو مجھے لرزا کر رکھ دیا۔لکھا تھا۔''بھائی میں بڑی مشکلوں سے بنگلور کے اس فلیٹ کی قید سے آزادی کی تمنا میں اپنے آبائی مکان میں آ گیا ہوں۔ میرا چھوٹا سا خوبصورت گاؤں سرسبز ہے۔ یہاں آ کر میں اپنی پوری زندگی میں برتی گئی غفلت کی تلافی میں مشغول ہوں۔''غفلت کی تلافی'' میں نے خود اپنی زندگی کا حساب کتاب شروع کیا۔ کئی راتیں اس کشمکش کی نذر ہوگئیں۔ کئی دنوں بعد پانچواں جملہ بہار کے خوشگوار جھونکے کی طرح دل و دماغ کو معطر کر گیا۔ پانچواں اور آخری جملہ تھا....''تمہاری بھابھی نے کھنڈروں میں چراغ جلائے ہیں اور پھولوں کی خوشبو سے میرا آنگن مہک اُٹھا ہے تم بھی آ کر دیکھو یار کھلی فضا کی خوشبو اور چہکتے ہوئے پرندوں سے آزادی کا نغمہ اور اس کی لذّت کا احساس۔''

○○

مونوگراف حضرت وارث شاہ

وارث شاہ جنھیں بجا طور پر پنجابی زبان، پنجابی شاعری اور پنجابی ثقافت، تہذیب و تمدن کا وارث کہا جاتا ہے، ان پر یہ مونوگراف بھرپور روشنی ڈالتا ہے۔ اس میں وارث شاہ کے حالاتِ زندگی بھی بھرپور تحقیق و توجہ کے ساتھ شامل کیے گئے ہیں۔ ہیر رانجھا کی کہانی کو اسی پیرائے میں پیش کیا گیا ہے جس میں وارث شاہ نے اسے تحریر کیا تھا تاکہ اس عظیم شاعر کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑ سکے۔

مصنف: رتن سنگھ صفحات: ۱۳۶، قیمت: ۴۵ روپے

ناشر: اردو اکادمی، دہلی